پروفیسر محمد شفیع اختر

امام غزالیؒ اور احیائے دین

ابوحامد محمد الغزالی ۴۵۰ھ میں خراسان کے شہر طوس میں پیدا ہوئے۔ بچپن ہی میں ان کے والد کا انتقال ہو گیا تھا۔ لیکن انھوں نے ان کو ایک صوفی دوست کے سپرد کر دیا تھا۔ ان صوفی بزرگ نے غزالی کو طوس کے ایک اچھے مدرسہ میں داخل کر دیا۔ یہاں سے فارغ ہو کر وہ جرجان پہنچے، یہاں جملہ علوم کی تحصیل کی اور پھر نیشاپور کے مشہور مدرسۂ نظامیہ میں جا کر ضیاء الدین الجوینی امام الحرمین کے درس میں شامل ہو گئے۔ یہاں انھوں نے فقہ اصول، منطق اور کلام کی تکمیل کی اور استاد کی وفات تک یہیں مقیم رہے۔ ۴۷۸ھ میں وہاں سے رخصت ہو کر معسکر پہنچے۔ اور درس ومطالعہ میں مصروف ہو گئے۔ غزالی کے علم وفضل اور تصنیفات کی شہرت شہر نیشاپور سے نکل کر تمام دنیائے اسلام میں پھیل گئی۔ ۴۸۶ھ میں وہ نظام الملک کی درخواست پر بغداد آئے اور مدرسۂ نظامیہ کے شیخ مقرر ہوئے۔ وہاں ان کے علم وفضل کی وہ شہرت ہوئی اور خلفا وسلاطین کے ہاں ان کو وہ منزلت حاصل ہوئی جو کسی عالم کو بھی نصیب نہیں ہوئی تھی اور دولت و ثروت اور جاہ ومنصب سب کچھ ان کو عطا ہوا۔ مگر وہ بہت جلد اس قدر و منزلت سے بیزار ہو گئے اور سب کچھ ترک کر کے حج بیت اللہ کو چلے گئے۔ وہاں سے فارغ ہو کر دمشق پہنچے اور دس برس تک جامع اموی کے ایک مینارے میں معتکف رہے اور عبادت و ریاضت اور تصنیف وتالیف میں مصروف رہے۔ اس کے بعد نیشاپور آئے اور پھر اپنے وطن طوس کو واپس گئے۔ نظام الملک نے ان کو دوبارہ مدرسۂ نظامیہ کی صدارت پیش کر کے یہ درخواست کی کہ وہ بغداد میں قیام کریں تاکہ لوگ ان سے فیض حاصل کر سکیں چنانچہ غزالی پھر بغداد آئے لیکن تھوڑے ہی دنوں میں دل اُچاٹ ہو گیا اور طوس واپس چلے گئے۔ طوس دنیائے علم کا مرکز بن گیا اور وہیں علوم و معارف کا چشمہ جاری رہا حتّٰی کہ ۵۰۵ھ

میں غزالی نے وفات پائی۔

عالم اسلام کی حالت

اس دور میں عالم اسلام مختلف آرا اور تحریکات مذاہب میں بٹا ہوا تھا اور ہر فریق یہ سمجھتا تھا کہ ناجی صرف وہی ہے اور ہر جماعت اپنے سرمایہ پر نازاں وخوش تھی۔ لیکن ظاہر ہے کہ ہر فریق صواب پر نہیں ہو سکتا تھا اس لیے غزالی کے سامنے یہ سوال آیا کہ ان حالات میں وہ کیا کریں۔

کسی ایک فریق کا ساتھ دینے کا مطلب تقلید اور دوسروں پر سختی کرنا تھا۔ اس لیے دانش مندی کا تقاضا یہ تھا کہ بحث وتفتیش اور صریح وجری تنقید سے کام لیا جائے اور جو حق منکشف ہو اسے قبول کیا جائے۔ غزالی نے یہی کیا۔

جس سال غزالی پیدا ہوئے اسی سال آل بویہ کا بغداد سے خاتمہ ہوا تھا۔ اور جب وہ علوم سے فارغ ہو کر دین کی خدمت کے لیے آئے تو دورِ تشکیک کے دو سو برس گزر چکے تھے۔ اس میں ایک طرف تو باطنیہ، اسماعیلیہ، فرامسطہ، اخوان الصفا اور اسی قسم کی بہت سی جماعتیں تھیں جنھوں نے دینی حقائق پر شک پیدا کر کے دین کی کسی اصل کا اعتبار نہ چھوڑا تھا۔ دوسرا طبقہ فلاسفہ، معتزلہ اور عقیلیین کا تھا جو دین کی خالص عقلی ومنطقی توجیہ وتعبیر کرتے تھے اور ان کا کام اپنے فرقوں کی تعلیمات کو یونانی فلسفہ کے مطابق بنانا تھا۔ اس کوشش میں وہ حد سے تجاوز کر گئے اور جدلیات کا ایک ایسا وسیع دروازہ کھل گیا کہ دین صرف بحث ومناظرہ بن کر رہ گیا۔ اس کی اخلاقی قدریں ختم ہو گئیں اور عملی زندگی سے اس کو کوئی واسطہ نہ رہا۔ اس باب میں اگرچہ اشاعرہ نے بہت کچھ اصلاح کی کوشش کی مگر انھوں نے بھی بالآخر دین کو فلسفہ بنا ڈالا اور امت کو ایک گورکھ دھندے سے نجات ملی تو دوسرے میں پھنسنا پڑا اور مناظرہ ومجادلہ کا بازار پہلے کی طرح اب بھی گرم رہا۔ تیسرا گروہ فقہا کا تھا جو پہلے دونوں گروہوں کو باطل سمجھتا تھا اور اس کا اپنا خیال یہ تھا کہ وہ شریعت کے ظواہر پر بے حد مصر تھا اور اس سے ادنیٰ انحراف کو بھی کفر جانتا تھا۔ ان کی اس سختی نے لوگوں کو دین سے بیزار کر دیا اور عوام کے دلوں سے دین وعلماء دین کا

احترام اٹھ گیا۔ چوتھا گروہ صوفیا کا تھا۔ جو کہتے تھے کہ دین و شریعت کی اصل حقیقت صرف مجاہدہ و ریاضت سے حاصل ہو سکتی ہے۔

غزالی نے ان سب گروہوں کا تفصیلی و تحقیقی جائزہ لیا اور پھر امت کی رہنمائی کے واسطے ایک نئی راہ نکالی۔

(۱) فلسفہ : سب سے پہلے فلسفہ کی طرف متوجہ ہوئے، اس کے نشیب و فراز سے واقف ہوئے اور اس کی گہرائیوں میں اُترے۔ ان کے تمام حقائق پر نظر ڈالی۔ پھر بتایا کہ فلسفہ کے صحیح حدود کیا ہیں اور دین کے سلسلہ میں اس کی اصلی اہمیت کیا ہے۔ غزالی خود بہت بڑے فلسفی اور مفکر تھے۔ انھوں نے فلسفہ کے اکثر مزعومات کی تردید کی اور اس کی گمراہیوں اور ضلالتوں سے لوگوں کو آگاہ کیا۔ بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ عقل کے خلاف اور روایت کے حامی ہیں۔ لیکن حقیقت یہ نہیں ہے۔ ان کی مخالفت کے دو بڑے اسباب تھے۔ ایک تو یہ کہ اس دَور میں علومِ عقلیہ کا بڑا زور اور غلبہ تھا۔ اور یہ غلط فہمی عام ہو گئی تھی کہ دین و شرائع کی معرفت اور حیات و ممات کی حقیقت صرف عقل سے دریافت ہو سکتی ہے، کسی نبوت کا احسان مند ہونے کی ضرورت نہیں۔ انبیا کی سیرت کسی کے لیے نمونہ نہیں اور قلب و روح کی تسکین صرف فلاسفہ کر سکتے ہیں۔ اس عقیدے کے بعد تکلیفاتِ شرعیہ کی ضرورت نہیں رہی۔ کیونکہ ان کو محض لاحاصل سمجھا گیا۔ ان دونوں باتوں کا مجموعی نتیجہ یہ ہوا کہ دین اور علما کا استہزا عام ہو گیا۔ اخلاقی پابندیاں اٹھ گئیں اور فسق و فجور کا بازار گرم ہوا اور خواص و عوام دونوں ہی بگڑ گئے۔ غرض یہ کہ فلسفہ اور دیگر علومِ عقلیہ نے ایک طرف تو دین کی علمی بنیادیں کھوکھلی کر دیں اور دوسری طرف عملاً اس کو بے معنی کر دیا۔

دوسرا سبب یہ تھا کہ اس دَور میں فلسفہ و حکمت نے کچھ ایسے بنیادی مسائل چھیڑے جو دین کی اساسی قدروں میں شک و شبہ پیدا کرتے تھے، بلکہ ان کی نفی کرتے تھے۔ عوام فلسفہ نہیں جانتے تھے لیکن اس کے نتائج سن کے گمراہ ہو جاتے تھے۔ غزالی نے ان مسائل کا جائزہ لیا اور بتایا کہ ان میں سے بعض تو کفر کی حد تک پہنچتے ہیں۔ بعض

بدعت کی طرف لے جاتے ہیں اور بعض بے ضرر ہیں۔ لیکن مجموعی طور پر ان سب مسائل کی بحث مضر ہے۔ کیونکہ عوام جب دیکھتے ہیں کہ ان میں سے بعض درست اور قابل قبول ہیں تو دوسرے بھی ویسے ہی ہوں گے۔ حالانکہ عام مسائلِ علوم اور ہیں اور مسائل الٰہیات اور ہیں۔ دونوں کے پرکھنے اور جاننے کا نہ تو طریقہ ایک ہے اور نہ معیار ایک ہے۔ غزالی نے اس موضوع پر ایک شہرۂ آفاق کتاب "تہافۃ الفلاسفہ" لکھی اور ان تمام گمراہیوں کا سدباب کیا۔ انھوں نے طرزِ تحریر ایسا دلکش اور ادیبانہ اختیار کیا کہ معمولی علم والا بھی اس کو سمجھ سکے۔ پھر فلسفہ کی اصطلاحات اور الجھنوں کو ایسا صاف اور منقح کر کے پیش کیا کہ اس کے مسائل اور حقائق خاص و عام پر واضح ہوگئے۔

اب رہا یہ سوال کہ آیا غزالی اس مہم میں کامیاب ہوئے؟ تو جواب یہ ہے کہ ان کی کامیابی میں ذرہ برابر شبہ نہیں ہوسکتا۔ فلسفہ پر تنقید کر کے انھوں نے تین بڑے کام انجام دیے۔ (۱) دین اور فلسفہ کی حدیں مقرر کر کے ان کا دائرہ فکر و عمل متعین کر دیا اور ان کے نقطہ ہائے اشتراک بنا دیے۔ (۲) لوگوں کے دلوں سے فلسفہ کی مرعوبیت نکال دی اور اب فلسفہ حاکم و ثالث کی حیثیت کا مالک نہ رہا بلکہ خود دینی توجہ و التفات کا منتظر رہنے لگا۔ (۳) دین کو فلسفہ کے احساناتِ بے جا سے بچا لیا اور سمجھایا کہ دین کے حقائق و معارف کی شرح تو فلسفہ کسی حد تک کر سکتا ہے مگر از خود اس کو حاصل نہیں کر سکتا۔ اور ان حقائق کے معلوم کرنے کا واحد ذریعہ نبوت ہے جو عقل و اکتساب سے نہیں ملتی۔

ابنِ رشد نے غزالی کی تردید میں تہافۃ التہافہ لکھی اور ثابت کیا کہ غزالی نے نہ دین سمجھا اور نہ فلسفہ۔ یہ الزام کسی طرح درست نہیں۔ کیونکہ غزالی نے جو دین کی شرح کی اس سے بہتر شرح آج تک مشرق و مغرب میں کوئی نہ کر سکا اور رہا فلسفہ تو وہ ان کا مقصود نہ تھا بلکہ اس کی بحث اضطراراً آگئی۔ اور اس کی تحقیق غزالی نے محض اس واسطے کی کہ دین کو اس کی زد سے بچائیں۔ اسی لیے ان کی تحریروں میں انتہائی خلوص، شیرینی اور لطافت پائی جاتی ہے اور ابنِ رشد کے وہاں صرف خشکی اور باریک بینی ہے۔

یہ بات واضح رہے کہ غزالی فلسفہ کے دشمن تھے بلکہ اس کو دین کا خادم سمجھتے تھے کیونکہ یہ امر کسی طرح ثابت نہیں کہ دین کے کسی مسئلہ کی تحقیق فلسفہ کے بغیر نہیں ہوسکتی اور اس کے تمام اساسی مسائل فلسفہ کے مسائل ہیں۔ غزالی کا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے فلسفہ کو دین کے تابع بنا دیا۔ ان سے پہلے دین نہ صرف فلسفہ کے تابع تھا بلکہ اس کے ہاتھوں مظلوم تھا۔ ان کا اپنا انداز نہایت حکیمانہ اور استدلال فلسفیانہ تھا اور اگر وہ علوم عقلیہ کے امام نہ ہوتے تو ان کے اصلی مسائل اور نکات پر ان کی نظر بھی نہیں پڑتی۔ البتہ یہ ضرور ہوا کہ فلسفہ کی تردید میں وہ تجاوز کر گئے اور اس کی اس وقت ضرورت بھی تھی۔ کیونکہ اس وقت فلسفہ اسلام کے سر پر چڑھ کر بول رہا تھا اور دین و اخلاق سب کی قدریں مٹا رہا تھا۔ اس لیے اعتدال کا دامن تھامے رہنا ممکن نہ تھا۔

متکلمین

غزالی کے نزدیک کلام کا مقصد ہر قسم کے شطط و طعن سے عقیدہ کی حفاظت کرنا ہے۔ ایسے انسان کے عقیدے کی حفاظت کرنا جس نے اسلام میں پرورش پائی ہو اور کتاب و سنت سے اپنا عقیدہ اخذ کیا ہو، لیکن کسی ایسے شخص میں جو نہ مومن پیدا ہوا اور نہ جس نے اسلام میں پرورش پائی ہو علم الکلام عقیدۂ اسلام نہیں پیدا کرسکتا اور یہ اس کا مقصد بھی نہیں۔ لہذا اس کی حفاظت کے لیے متکلم شک کرنے والوں کے مقدمات کو اپنا لیتا ہے اور انھیں کے مسلمات سے ان کو شکست دینے کی کوشش کرتا ہے۔ اور یہ مقدمات اکثر واہی وضعیف ہوتے ہیں۔ یہ تو ہے علم الکلام کا مقصود۔ لیکن غزالی کا مقصود حقیقت دینی کا ایسا ادراک ہے جس کی عقل تائید کرے اور جو وقت اور موضوع میں علم ریاضی کے درجے کو پہنچ جائے۔ دونوں مقصدوں کا فرق بیّن ہے۔ اسی لیے غزالی متکلم کو مشورہ دیتے ہیں کہ اس علم سے غیر مسلم کو اصلاً کوئی فائدہ نہیں پہنچ سکتا۔ اور نہ بیماری شک کا کوئی علاج ہے۔ چنانچہ اس سے کوئی ایسی بات نہیں حاصل ہوتی جو خلق کے ظلمات حیرت کو یکسر مٹا سکے۔

پھر علم الکلام کو سب سے زیادہ دلچسپی جدل و مناظرہ اور اختلافات سے ہے اور

ان باتوں سے کسی کی عقل تو شاید مطمئن ہو جائے لیکن اس کا دل کبھی مطمئن نہیں ہوتا۔ مناظرہ کی برائیوں پر غزالی نے احیا میں ایک طویل باب باندھا ہے جس میں بتایا ہے کہ بحث و خصومت میں آدمی اکثر حق کا دامن چھوڑ دیتا ہے اور جھوٹ، فریب دہی، ضد، بدکلامی اور بہت سے رزائل اخلاق کا شکار ہو جاتا ہے اور سب سے افسوس ناک بات یہ ہے کہ مناظر کو اپنے پیشے سے الفت ہو جاتی ہے اور وہ سوتے، جاگتے، تنہا اور انجمن میں ہر جگہ کلام کرتا رہتا ہے وہ اپنی تعمیرِ سیرت اور تطہیرِ نفس کی طرف کبھی متوجہ نہیں ہوتا۔ ظاہر ہے کہ ایسے علم کا نہ دنیا میں کوئی فائدہ ہے نہ آخرت میں۔

غزالی اپنے دور میں کلامی مناظرات کے سب سے بڑے امام تھے اور خلفا و سلاطین کے دربار میں انھوں نے بڑے بڑے معرکے سر کیے تھے۔ لیکن آخری عمر میں اپنی خود نوشتہ سرگزشت المنقذ من الضلال میں لکھتے ہیں کہ مناظرات کی ان فتوحات سے مجھ کو سوائے عجب و غرور اور لذتِ برتری کے اور کچھ حاصل نہیں ہوا۔ دین کو اس سے کوئی فائدہ نہیں پہنچا۔ خلاصہ یہ کہ علم الکلام ان کے نزدیک ایک ایسی چیز ہے جس میں نقصان کثیر اور نفع قلیل ہے۔ اس لیے انھوں نے اس علم کی مذمت میں بھی دریغ نہیں کیا۔ اور یہ حقیقت ہے کہ غزالی کے بعد مناظرات اور کلامی بحثوں کا زور کم ہو گیا اور دنیائے اسلام کو اس سے بڑی حد تک نجات مل گئی۔

فقہا

فقہا اور متکلمین میں کسی حد تک اتفاق تھا، لیکن دونوں کے میدان الگ تھے۔ چوتھی صدی میں فقہ کا تقلیدی دور شروع ہو چکا تھا اور پانچویں صدی میں عصبیتِ مذاہب نے بھی افسوس ناک شکل اختیار کر لی تھی۔ معتزلہ کے خلاف ظواہرِ دین پر بڑا اصرار تھا اور باطنیہ نے تکلیفاتِ شرعیہ کا بار بالکل ہی اٹھا دیا تھا اس لیے فقہا اپنے رویہ میں اور بھی سخت ہو گئے تھے۔ لیکن عوام ان پابندیوں اور سختیوں کے متحمل نہیں تھے۔ دوسری طرف فقہا میں ایک اور خرابی پیدا ہو گئی تھی، وہ جزئیاتِ فقہ کی موشگافیوں کو اصل دین سمجھنے لگے تھے اور شریعت کی اصلی روح جاننے کی سعی نہیں کرتے تھے بلکہ

لغوی اور نحوی جدت طرازیوں اور منطقی نکتہ سنجیوں سے کام لیتے تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ فقہ چند خشک بے لوچ اور بے مزہ رسوم و اعمال کا نام رہ گیا۔ غزالی کا یہ بہت بڑا کارنامہ ہے کہ انھوں نے فقہ کے ہر ہر باب کو لے کر اس کی حکمت بیان کی۔ مومن کی مجموعی سیرت سے اس کا تعلق واضح کیا اور دین کے جامع نظام سے اس کا رابطہ قائم کر دیا۔ ان کی کتاب احیاء علوم الدین انہی اسرار و حکم کی اسلامی ادب میں آج تک سب سے بڑی دائرۃ المعارف ہے۔

اس سے بڑھ کر غزالی نے یہ سمجھایا کہ فقہ فی نفسہٖ مقصود نہیں بلکہ اس کی غایت مکارمِ اخلاق کی تکمیل اور انابت الی اللہ ہے۔ فقہ کی اس توجیہہ سے اس کی روح و معانی میں زبردست تغیر واقع ہو گیا اور دنیائے اسلام پھر اصل دین کی طرف مائل ہو گئی۔ سلجوقیوں نے غزالی کی تعلیمات کو بڑی اشاعت دی۔ چھٹی صدی کے وسط تک احیائے دین کی یہ تحریک بڑی حد تک کامیاب ہو چکی تھی۔ اور اگر اس صدی کے اواخر میں سلجوقیوں کا شیرازہ بکھر نہ گیا ہوتا تو شاید سقوطِ بغداد کا سانحہ پیش نہ آتا۔ غزالی نے فقہ میں جو روح ڈالی وہ صدیوں تک مضمحل نہیں ہوئی۔

باطنیہ

باطنی تحریک دو سو برس سے عالمِ اسلام کے دین و معاشرت، سیاست و معیشت اور ملّی وحدت کو پارہ پارہ کر رہی تھی۔ باطنی فرقوں کا مرکزی اصول تاویل ہے۔ یعنی یہ کہ الفاظِ قرآن کا ایک ظاہری مفہوم ہے جو مقصود نہیں اور ایک باطنی مفہوم ہے اور وہی مراد ہے اور یہ باطنی مفہوم صرف امتِ معصومین جانتے ہیں اس لیے تاویل کا حق صرف انہی کو ہے۔ اس نظریۂ تاویل نے تخریب کا ایک ایسا باب کھول دیا کہ اس سے نہ صرف دین کی روح نکل گئی بلکہ اس کی شکل بھی بدل گئی۔ اسی تاویل سے توحید، آخرت، رسالت، قرآن سب کے معانی بدل گئے اور نماز، روزہ، زکوٰۃ، حج کے معنی امامِ معصوم کی اطاعت کے ہو گئے۔ اس طرح تاویل سے باطنیت کا ایک مکمل فلسفہ اور پیچیدہ نظام تیار ہوا جس نے حسن بن صباح اور قرامطہ کے زمانے میں اسلام سے کھلی بغاوت کی۔

اس عہد میں خلفائے عباسی کا صرف نام باقی تھا۔ حکومت کے اصلی مالک بویہین تھے جو اس تحریک کو خوب ہوا دے رہے تھے کیونکہ وہ خود اسی کی پیداوار تھے۔ یہ دَور دنیائے اسلام کے لیے انتہائی مایوس کن تھا اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ شاید اسلام کا نشان تک باقی نہیں رہے گا۔ سلطان محمود غزنوی نے کچھ حالات سنبھالنے کی کوشش کی لیکن زیادہ کامیابی نہیں ہوئی۔ ۴۴۷ھ میں تختِ بغداد پر سلاجقہ آئے۔ انھوں نے فاطمیین اور باطنیہ دونوں کا مقابلہ کیا اور ان کے استیصال میں بڑی حد تک کامیاب ہوئے۔ لیکن انھوں نے محسوس کیا کہ باطنی فرقہ کا علاج محض سختی نہیں ہے کیونکہ اس سے عوام کی ہمدردیاں ان کے ساتھ ہو جائیں گی۔ صحیح علاج یہ ہے کہ پُرزور اور منظم طریقہ سے ان کی دعوت کا مقابلہ کیا جائے اور قابل و ذہین مناظر تیار کیے جائیں جو برسرِعام ان کی پھیلائی ہوئی غلطیوں کو بے نقاب کریں۔ اس غرض سے انھوں نے بڑے شہروں میں عظیم الشان مدارس قائم کیے جو نظامیہ کے نام سے مشہور ہوئے اور ابو اسحاق اسفرائینی اور امام الحرمین الجوینی جیسے فاضل اساتذہ کی خدمات حاصل کیں۔ ان علما کو یہ بھی ترغیب دی گئی کہ وہ باطنیت اور ہر قسم کی بدعت و الحاد کے خلاف موثر کتابیں لکھیں۔ چنانچہ تھوڑے ہی عرصے میں ایک عظیم الشان اصلاحی ادب تیار ہو گیا۔ ان مصنفین و مصلحین کے رئیس امام غزالی تھے۔ انھوں نے باطنیہ کا پورا لٹریچر پڑھا۔ ان کے تمام حالات سے اچھی طرح آگاہ ہوئے اور فضائح باطنیہ کے نام سے ایک ایسی جامع اور مدلل کتاب لکھی جس نے نظری و علمی اعتبار سے باطنیہ کا خاتمہ کر دیا۔ پھر اپنی دوسری تصانیف میں بھی انھوں نے باطنیت پر کاری ضربیں لگائیں۔

حقیقت یہ ہے کہ باطنیت کے خلاف غزالی کی جد و جہد اسلام کی بہت بڑی خدمت ہے۔ یہ فرقہ حکمت و حکومت کی طاقتوں سے اتنا مسلح ہو گیا تھا کہ اس کا دبانا امرِ محال نظر آتا تھا۔ لیکن سلجوقیوں کی تلوار سے جو کام نہ ہو سکا وہ غزالی کے سحر آفریں قلم سے انجام پا گیا۔

صوفیا

غزالی کی سب سے بڑی آرزو دین کی صحیح حقیقت معلوم کرنا تھا۔ روایتی دین اور تقلید

کے وہ بالکل روادار نہ تھے۔ فلسفہ، کلام، جدل و مناقشات اور عقل کی کارسازیوں کو بھی رد کر چکے تھے۔ لہٰذا اب صرف تصوف کی راہ ان کے سامنے کھلی رہ گئی تھی۔ نظامیہ بغداد چھوڑنے اور دمشق میں دس برس تک اعتکاف کرنے کے بعد ان کو یقین ہو گیا کہ جو چیز وہ ڈھونڈ رہے تھے کہیں باہر نہیں مل سکتی۔ اگر مل سکتی ہے تو صرف قلب کی گہرائیوں میں۔ اگر کوئی شخص ریاضت اور محنت و عبادت سے قلب کو آلائش دنیا سے پاک کرے تو اس کو خزائنِ حکمت مل سکتے ہیں۔ انھوں نے اپنے لیے یہی راہ پسند کی اور جو خزائن ان کو ملے وہ قرنِ اولیٰ کے بعد امتِ محمدیہ میں شاید ہی کسی کو ملے ہوں۔

غزالی نے تصوف کی راہ اس لیے پسند کی کہ وہ اس کی اخلاقی برتری اپنی آنکھوں سے دیکھ چکے تھے۔ ان کے باپ اور چچا اگرچہ عالم نہیں تھے لیکن عابد و زاہد تھے۔ ان کے اکابر اساتذہ مثل امام الحرمین نہ صرف جیّد عالم تھے بلکہ معارف باطنی سے بھی بہرہ مند تھے اور ان کے تقویٰ کی زمانہ میں دھوم تھی۔ پھر انھوں نے دیکھا کہ ان صوفیا کا عمل ریا د نفاق سے پاک ہے۔ ان کے اقوال و مواعظ میں بحث و جدل کا کوئی تذکرہ نہیں۔ وہ زخارفِ دنیا سے بالکل متاثر نہیں۔ اس راہ میں اخلاق و سیرت کی سطحیں بلند ہوتی ہیں۔ [illegible] عملی زندگی میں اخلاص رونما ہوتا ہے۔ قلب کو یکسوئی کی دولت میسر آتی ہے۔ [illegible] وسعت [illegible] پیدا ہوتی ہے اور عادات و اطوار رضائے الٰہی کے سانچے میں ڈھلتے ہیں۔ اس لیے انھوں نے اسی تصوف کی دنیا میں قیام کیا اور باقی زندگی یہیں گزار دی۔

یہاں ان کو معلوم ہوا کہ علم کا سب سے زیادہ قابلِ اعتبار ذریعہ مکاشفہ ہے۔ اور یہ صرف ریاضت و عبادت اور انابت الی اللہ سے حاصل ہوتا ہے۔ غزالی کے نزدیک یہ کوئی علمی نظریہ نہیں تھا۔ انھوں نے اسی مکاشفہ سے سب کچھ حاصل کیا۔ چنانچہ ان کی پہلی تصانیف میں جدل و عقلیت کا رنگ زیادہ ہے اور وہ صرف فقیہ و متکلم نظر آتے ہیں۔ لیکن اس روحانی ہجرت کے بعد انھوں نے جو کچھ لکھا سراپا حکمت ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ اسلام کی سرگزشت نہیں، بلکہ حسن و عشق کی داستان بیان کر رہے ہیں۔

غزالی سے پہلے تصوف کو فقہا و محدثین اچھی نظر سے نہ دیکھتے تھے۔ لیکن غزالی نے اس کی نئی تعریف کرکے اور اس کو شریعت کا جامہ پہنا کے ان جماعتوں کی نظر میں بھی محبوب بنا دیا اور دین کی رسم پرستی کو قلب کی گرمی و لذت سے آشنا کر دیا۔ یہ ان کی ایک عظیم الشان خدمت ہے۔ ادیان حرف پرستی سے مٹ جاتے ہیں۔ دین صرف قوانین کے مجموعہ کا نام نہیں بلکہ دین دراصل وہ روح ہے جو ان قوانین کی محرک ہے۔ غزالیؒ نے عالم اسلام میں یہ روح بیدار کر دی اور یہی ان کا سب سے بڑا کارنامہ ہے۔

حیاتِ محمدؐ

از محمد حسین ہیکل۔ اردو ترجمہ: ابو یحییٰ امام خاں

مصر کے نامور ادیب اور محقق محمد حسین ہیکل کی مشہور تصنیف "سیرۃ النبی محمدؐ" کا اردو ترجمہ ہے۔ اس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کے حالات نہایت مؤثر اور دلنشین انداز میں لکھے گئے ہیں اور ان واقعات کو خصوصیت سے اجاگر کیا گیا ہے جن کا تعلق زندگی کے بنیادی حقائق اور اس دور کے اہم مسائل سے ہے۔ اس کتاب کی ایک خوبی یہ ہے کہ اس میں مستشرقین کے ان تمام اعتراضات کا نہایت مدلل جواب دیا گیا ہے جو وہ اسلام اور پیغمبرِ اسلام پر کرتے رہتے ہیں۔

صفحات: ۸+۶۵۴ قیمت: ۲۷/۰۰ روپے

ملنے کا پتہ

ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ، کلب روڈ، لاہور